حقیقت واقسامِ شرک (۳)

بانئ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ..... امَّا بَعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِہٖ وَھُوَ یَعِظُہٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ ط اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾﴾ (لقمٰن) ..... صدق اللّٰہ العظیم

''اور یاد کرو جب کہ لقمان نے کہا اپنے بیٹے سے' اور وہ اسے نصیحت کر رہے تھے' کہ اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کیجیو' یقیناً شرک بہت بڑا ظلم (اور بہت بڑی ناانصافی) ہے''۔

مسئلۂ نور و بشر

گزشتہ دو نشستوں میں الحمد للہ اقسامِ شرک کے حوالے سے شرک کی پہلی قسم ''شرک فی الذات'' کی بحث مکمل ہو چکی ہے۔ اس نشست میں شرک کی دوسری قسم ''شرک فی الصفات'' کی بحث شروع کرنے سے پہلے میں ایک اہم علمی نکتے پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے ہاں ایک مسئلہ مذہبی بحث و نزاع کا موضوع بنا ہوا ہے۔ وہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ''بشریت'' اور ''نور'' کا مسئلہ ہے کہ آپؐ بشر تھے یا نور۔ عوامی سطح پر جو مذہبی جلسے ہوتے ہیں ان میں اکثر و بیشتر اسی مسئلے پر گفتگو ہوتی ہے' دھواں دار تقریریں ہوتی ہیں جن میں جوش و خروش اور غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک گروہ رسول اللہ ﷺ کی بشریت کی نفی اور نورانیت کے اثبات پر اور دوسرا گروہ آپؐ کی نورانیت کی نفی اور بشریت کے اثبات پر بہت زیادہ زور لگاتا ہے جس سے مناظرے اور مباحثے کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور ایک نزاع کا عالَم پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں نزاع کا قطعاً کوئی پہلو نہیں ہے۔ اس سلسلے میں محض کھینچ تان اور جوشیلی تقریروں کی وجہ سے بات بگڑتی ہے اور فریقین میں باہم شدت اور تلخی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

جان لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کے معاملے میں نہ یہ کہنا درست ہے کہ آپ ﷺ بشر نہیں تھے بلکہ نور تھے اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ آپؐ نور نہیں تھے بلکہ بشر تھے۔ دونوں باتیں یکساں غلط ہیں' اصل حقیقت یہ ہے کہ آپؐ بیک وقت بشر بھی تھے اور نور بھی تھے۔ اور یہ معاملہ صرف رسول اللہ ﷺ کا نہیں ہے بلکہ میرا اور آپ کا اور ہر انسان کا ہے۔ ہر انسان کے اندر اس کے وجود کے دو حصے ہیں۔ ایک اس کا ''حیوانی'' وجود ہے۔ وہ خاکیٔ الاصل ہے جو اِس زمین

سے بنا ہے۔ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے ظُلمانی ہے۔ اس میں تاریکی ہے‘ اس میں پستی کا رجحان ہے‘ اس میں برائی کا میلان ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ’’اور میں اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں‘ یقیناً نفس تو برائی پر اُبھارتا ہے‘‘۔ لیکن انسان مجرد اِس پستی اور خاکیُ الاصل وجود ہی کا نام نہیں ہے‘ بلکہ اس کے وجود کا دوسرا حصہ ’’روح‘‘ ہے۔

نقطۂ نوری کہ نامِ او خودی
زیر خاکِ ما شرارِ زندگی

انسانِ اوّل کو آدم علیہ السلام بنانے والی چیز یہی روحِ خداوندی تھی جو اُن میں پھونکی گئی۔ اور وہ روح خاکی اور ظلمانی نہیں ہے‘ بلکہ نورانی حقیقت رکھنے والی شے ہے۔ وہ ملائکہ کی ہم پلہ ہی نہیں ملائکہ کی مسجود ہے۔ ملائکہ نوری الاصل ہیں تو کیا روح خاکیُ الاصل ہے؟ نہیں‘ روح خاکی اور ظُلمانی نہیں ہے‘ بلکہ نورانی ہے۔ بقولِ اقبال:

ہے ذوقِ تجلی بھی اِسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

حواسِ خمسہ یعنی دیکھنا‘ سننا‘ سونگھنا‘ چکھنا اور چھونا تو حیوانات میں بھی ہیں! انسان نے بھی اپنی حقیقت اگر یہی سمجھی تو اُس نے گویا اپنی اصل عظمت کو نہیں پہچانا۔ ادراک تو اصل میں اپنے سے باہر کی کسی شے کو محسوس کرنا ہے‘ جبکہ روشنی تو خود اپنا ظہور چاہتی ہے‘ اپنی تجلی چاہتی ہے۔ تو انسان کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے وجود کے دو حصے ہیں‘ ایک اس کا یہ حیوانی وجود ہے‘ جو خاکیُ الاصل ہے‘ ظُلمانیُ الاصل ہے۔ اس کا میلان پستی اور گناہ کی طرف ہے۔ اور ایک اس کا روحانی وجود ہے جو نورانیُ الاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا تھا: ﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾﴾ (الحجر) ’’پس جب میں اسے (آدم علیہ السلام کو) بنا سنوار لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونکوں تو گر پڑنا اس کے سامنے سجدے میں‘‘۔ یہاں روح کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہے۔

تو یہ ہے ہمارا وہ نورانی عنصر جو ہر ایک انسان میں ہے۔ لیکن ع ’’درحفظِ مراتب نہ کنی زندیقی‘‘ کے مصداق سب کا نور برابر تو نہیں ہے۔ کسی کا محض ایک ٹمٹماتا ہوا دیا ہے۔ کسی کی اس نورانیت پر اس کے نفس کی ظلمانیت اس طرح چھا گئی ہے کہ وہ نور معدوم کے درجے میں ہے۔ یعنی اس کی فطرت کا نور بجھ چکا ہے‘ جبکہ کسی کا وہ نور اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے اس کی تمثیل یوں بیان کی ہے: ﴿يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ ۭ﴾ (النور:۳۵) ’’(کسی کی فطرت کا نور اتنا صاف اور شفاف ہے کہ) بھڑک اٹھنے کو بے تاب ہے‘ چاہے اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔ روشنی پر روشنی ہے۔‘‘ یہ ہے وہ نور جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں موجود تھا۔ ابھی وحی کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا‘ لیکن ان کے اندر اخلاقِ حسنٰی کے انوار پہلے سے موجود تھے۔ ایسے ہی تمام صدیقین اور انبیاء علیہم السلام کے اندر نورِ فطرت موجود ہوتا ہے۔ اب اس تناظر میں دیکھئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیتِ مبارکہ چونکہ بلندترین ہے تو آپؐ کی نورانیت بھی اتنی کامل ہے کہ اس نے خاکی وجود کی ظلمانیت کو بالکل معدوم کر دیا ہے۔ اس معنی میں اگر کہا جائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نورِ مجسم ہیں تو غلط نہیں ہے۔

تو یہ دونوں چیزیں بیک وقت صحیح ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیک وقت بشر بھی ہیں اور نور بھی ہیں۔ آپؐ کی بشریت کا کون انکار کرے گا! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی ہے جیسے کسی انسان کی ولادت ہوتی ہے۔ آپؐ کے بھی وہی دو ہاتھ اور دو پاؤں تھے۔ وہی انسانی خون آپ کے وجود میں بھی سرایت کیے

ہوئے تھا اور گردش کر رہا تھا۔ طائف میں آپؐ پر پتھراؤ ہوا ہے تو زخموں میں سے خون رسا ہے۔ میدانِ اُحد میں جب تلوار کا وار آپؐ کے چہرۂ مبارک پر لگا ہے تو خون کا فوارہ چھوٹا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے شادی کی ہے اور آپؐ کے ہاں اولاد ہوئی ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی نورانیت کی نفی ہرگز نہ کیجیے! آپؐ کی نورانیت کی نفی درحقیقت اِس دَور کا مادّہ پرستانہ فکر ہے جو میری آج کی بحث کا اصل موضوع ہے۔ ہم نے مادہ پرستانہ فکر اپنے ذہنوں پر اتنا مسلط کر لیا ہے کہ ہم روح کی حقیقت اور اس کے جداگانہ تشخص سے یا تو بالکلیہ منکر ہو گئے ہیں یا اس کا زبان پر ذکر لاتے ہوئے ہمیں حجاب محسوس ہوتا ہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں!

کہ روحانیت کی باتیں کرتے ہو؟ روح کی بات کرتے ہو؟ روح کو کوئی علیحدہ وجود مانتے ہو؟ تو یہ چیزیں ہمارے فکر اور نظریات کے دائرے سے اس طور سے باہر چلی گئی ہیں کہ اب ہم سمجھتے ہیں کہ انسان تو بس اسی حیوانی وجود کا نام ہے۔ ہم اپنے اس وجودِ حیوانی ہی کو اصل انسان سمجھے بیٹھے ہیں‘ اس لیے نورانیت کی نفی ہو رہی ہے۔

اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمارا جو نورانی عنصر ہے‘ ایمان اور عمل صالح سے اس کی نورانیت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے برعکس گناہوں اور نفسانیت سے یہ نور بجھتا چلا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ الحدید اور سورۃ التحریم میں دو جگہ میدانِ حشر کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اُس دن اہل ایمان کی شان یہ ہو گی کہ:

﴿ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ (الحدید)

’’اُس دن آپ مؤمن مردوں اور عورتوں کو دیکھیں گے کہ اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور اُن کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا۔ (اُن سے کہا جائے گا) آج بشارت ہے تمہارے لیے ایسے باغات کی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں‘ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔‘‘

آگے منافقین کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَاۗءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ﴾

(آیت ۱۳)

’’اُس دن منافق مردوں اور عورتوں کا حال (جو دنیا میں چراغ گل کر کے جائیں گے) یہ ہو گا کہ وہ اہل ایمان سے استدعا کریں گے: ذرا ہماری طرف دیکھو (ذرا ہمیں مہلت دو)‘ تاکہ ہم تمہارے نور سے استفادہ کریں۔ کہا جائے گا لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف (اگر ہو سکتا ہے تو دنیا میں واپس جاؤ) اور اس نور کی تحصیل کر کے آؤ۔‘‘

سورۃ التحریم میں ہے:

﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۸﴾

''اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ: اے ہمارے ربّ! ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما، یقیناً تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

اس نور کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ قیامت کے دن کسی کا نور بس اتنا ہوگا کہ اس سے صرف اس کے قدموں کے آگے روشنی ہو جائے گی، اور کسی کا نور اِس قدر ہوگا کہ اس کی روشنی مدینہ منورہ سے صنعاء تک پہنچے گی۔ یعنی اُس روز کسی کا نور بہت تھوڑا ہوگا کہ بس اس سے قدموں کے آگے آگے روشنی ہوگی۔ اور قیامت کے دن یہ نور بھی بہت غنیمت ہوگا جس کو نصیب ہو گیا۔ اس لیے کہ اندھیرے میں ایک ٹارچ بھی بہت غنیمت ہوتی ہے جس سے آپ بالآخر منزلِ مراد تک پہنچ سکتے ہیں۔ جبکہ کسی کا نور اُس روز بہت زیادہ ہوگا جس سے ہر سو چراغاں ہو جائے گا۔ یہ حفظِ مراتب ہے۔ اس تناظر میں دیکھئے تو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا نور کس قدر ہوگا! تو اِن باتوں کو ذہن میں رکھیے تو جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بیک وقت ''بشر'' بھی ہیں اور ''نور'' بھی ہیں۔ اور یہی معاملہ ہم سب کا بھی ہے۔ ہمارا ایک روحانی وجود ہے جو نوریُ الاصل ہے اور ایک مادی وجود ہے جو خاکیُ الاصل ہے اور ہماری شخصیتوں میں ان دونوں کا امتزاج ہے۔ کسی کی ظلمانیت اس نور پر ایسے غالب آ گئی ہے کہ نور معدوم ہو گیا ہے اور کسی کی ظلمانیت پر اس کی نورانیت کا اتنا غلبہ ہو گیا ہے کہ اس کی ظلمانیت کافور ہو گئی ہے۔

اسی حقیقت کو حدیث نبویؐ کی روشنی میں اس طرح سمجھ لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهٖ قَرِيْنُهٗ مِنَ الْجِنِّ)) قَالُوْا :وَاِيَّاكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ :((وَاِيَّايَ اِلَّا اَنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ فَلَا يَاْمُرُنِيْ اِلَّا بِخَيْرٍ)) (۱)

''تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے ہمراہ ایک ساتھی شیطان نہ سونپ دیا گیا ہو''۔ صحابہ کرامؓ نے (بڑی ہمت کر کے) دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپؐ بھی؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں میں بھی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلے میں میری مدد فرمائی تو میں نے اسے مسلمان بنا لیا۔ اب وہ مجھے سوائے بھلائی کے کوئی اور مشورہ نہیں دیتا۔''

(۱) صحیح مسلم، کتاب صفة القیامة والجنة والنار، باب تحریش الشیطان وبعثه سرایاه لفتنة الناس وان مع کل انسان قرینا۔

یہ رسول اللہ ﷺ کا بات کو سمجھانے کا ایک انداز تھا۔ بہرحال وہ نفس تھا تو سہی رسول اللہ ﷺ کے اندر بھی۔ آپؐ کا بطنِ مبارک بھی کھانے کو مانگتا تھا۔ بھوک کا احساس محمد ﷺ کو بھی ہوتا تھا۔ بھوک کی وجہ سے آپؐ پر بھی نقاہت طاری ہوتی تھی۔ طائف میں پتھراؤ کی وجہ سے جب بہت زیادہ خون بہا تو آپؐ پر نقاہت طاری ہوئی اور آپؐ بیٹھ گئے۔ اسی طرح اُحد میں بھی بہت زیادہ خون بہنے کی وجہ سے آپؐ پر نقاہت طاری ہوئی اور آپؐ بے ہوش ہو گئے۔ آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا جب انتقال ہوا تو آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس لیے کہ انسانی عواطف و میلانات اور احساسات و جذبات آپؐ کی شخصیت میں بتمام و کمال موجود تھے۔ لیکن ان چیزوں کی وجہ سے کبھی آپ ﷺ سے (معاذ اللہ) خدا کی معصیت کا صدور ممکن نہیں ہوا۔ آپؐ کو تمام بشری تقاضوں اور آثارِ طبیعی پر اس قدر قابو تھا کہ کوئی بھی چیز آپؐ سے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرا سکی۔

مسلمانوں میں اَوتار کا تصور

گزشتہ نشست میں مَیں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہندوؤں کے ہاں نو اَوتار تھے‘ ایک دسواں اَوتار اپنے آپ کو مسلمان کہنے والوں نے اُن میں شامل کرلیا ہے۔ اب اس بات کی ذرا تفصیل جان لیجیے! دراصل شیعیت کی بہت سی شاخیں ہیں۔ ہمارے ہاں جو معروف شیعہ ہیں وہ ’’اثنا عشری‘‘ ہیں‘ یعنی پہلے بارہ اماموں کے ماننے والے۔ ان کے خیال میں بارہویں امام غائب ہوگئے جو امامِ منتظر کہلاتے ہیں اور وہ اُن کے انتظار میں ہیں کہ دوبارہ آئیں گے۔ چھٹے امام پر ایک شاخ علیحدہ ہوگئی جو ’’شش امامیہ‘‘ کہلاتے ہیں۔ یعنی پہلے چھ امام تو ’’اثنا عشری‘‘ اور ’’شش امامیہ‘‘ کے مابین مشترک ہیں‘ لیکن اسماعیل‘ جو امام جعفر صادقؒ کے بڑے صاحبزادے تھے‘ ان سے اِن شش امامیہ والوں کی شاخ الگ ہوگئی۔ شش امامیہ والوں کی بھی آگے چل کر دو شاخیں ہوگئیں۔ ایک شاخ وہ ہے جو ہمارے ہاں ’’بوہرے‘‘ کہلاتے ہیں۔ ان کے غالباً ۳۲ ویں امام غائب ہوگئے۔ طاہر سیف الدین‘ جن کا انتقال ہوگیا‘ اور برہان الدین جو بمبئی میں رہتے ہیں‘ ان کے مذہبی پیشوا ہیں۔ یہ امام نہیں کہلاتے بلکہ داعی کہلاتے ہیں۔ شش امامیہ کی دوسری شاخ ’’اسماعیلی‘‘ ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق ان کے امام غائب نہیں ہوئے‘ بلکہ امامت کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ چل رہا ہے۔ اِس وقت پرنس کریم آغا خان ان کے امامِ حاضر ہیں۔ یہ امام کو معصوم مانتے ہیں۔

پیر شمس الدین سبزواری (۱) اور دیگر اسماعیلی مبلغین کے ذریعے اسماعیلیت کی دعوت جب ہندوستان میں دی گئی تو ان مبلغین نے دعوت وتبلیغ کے لیے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ چونکہ ہندوؤں کو مسلمان بنانا آسان کام نہیں‘ لہٰذا ان کے عقیدوں کے ساتھ ہی ذرا اپنے عقیدے کو جوڑ وتوبات بن جائے گی۔ ہندو نو اَوتار مانتے تھے‘ انہوں نے یہ کہا کہ نو اَوتار تمہارے ہیں اور دسواں اَوتار ایک اور آیا ہے اور وہ حضرت علی ؓ ہیں۔ اس مذہب میں ’’دشم اَوتار‘‘ یعنی دسواں اَوتار حضرت علی ؓ کو مانا جاتا ہے۔ اَوتار یا Incarnation کا یہ عقیدہ باضابطہ طور پر ان کے عقائد میں شامل ہے۔

(۱) ان کا مزار ملتان میں ہے جو خواہ مخواہ شمس تبریز کے نام سے مشہور ہوگیا ہے۔ حالانکہ شمس تبریز کا ملتان میں آنے کا کوئی سوال اور امکان ہی نہیں ہے۔

دوسرا کام ان مبلغین نے یہ کیا کہ ہندوستان میں نئے ایمان لانے والوں پر سے شریعت ساقط کردی۔ ظاہر بات ہے اگر کسی کو اسلام یا دین کی تعلیم دی جائے اور اس کو یہ بھی معلوم ہو کہ پانچ نمازیں بھی پڑھنی پڑیں گی‘ تیس روزے بھی رکھنے پڑیں گے‘ تو وہ اسلام میں داخل ہونے سے پہلے دس دفعہ خوب سوچے گا۔ لیکن اگر اسے یہ کہا جائے کہ کوئی شریعت تم پر لاگو نہیں ہوگی‘ بس تم کلمہ پڑھو‘ تو اس کے لیے اب کام آسان ہوجائے گا۔ جیسے سینٹ پال نے کہا تھا کہ بس حضرت مسیح (علیہ السلام) کو مان لو تو تمہارے گناہوں کی طرف سے وہ پیشگی کفارہ ہوجائیں گے‘ تمہارے اوپر شریعت کا بھی بوجھ نہیں ہوگا اور حلال وحرام کی قید بھی نہیں ہوگی‘ چاہے خنزیر کھاؤ اور شراب پیو۔ چنانچہ ان کے ہاں پہلے سے جو مشرکانہ عقائد تھے ان پر عمل پیرا رہتے ہوئے اپنی تثلیث بنالی اور حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دے کر اس عقیدے سے اپنے مذہب کو جوڑ دیا۔ تو اس طرح سے سینٹ پال والی عیسائیت جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ یعنی یہی کام ہندوستان میں اسماعیلی داعیوں نے کیا کہ شریعت ساقط قرار دے دی۔ لہٰذا ہمارے آغا خانیوں کے ہاں نماز روزہ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ ان کی مسجدیں نہیں ہوتیں‘ محض جماعت خانے ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت کلبوں اور چوپال کی ہے جہاں وہ آکر بیٹھتے ہیں اور ساتھ مل کر کھانا وغیرہ کھاتے ہیں۔ جماعت خانہ ان کی سوشل لائف کا ایک مرکز ہے۔ باقی یہ کہ شریعت اُن سے ساقط ہے۔ البتہ ہمارے شمالی علاقے ہنزہ اور چترال میں جو اسماعیلی آباد ہیں‘ ان کے ہاں شریعت موجود ہے۔ اس لیے کہ وہ local converts نہیں ہیں‘ بلکہ وہ ایران سے آئے تھے۔ جبکہ بمبئی اور کاٹھیاواڑ وغیرہ کے علاقے میں مقامی لوگوں نے جو اسماعیلیت قبول کی ہے اس میں ایک تو شریعت ساقط ہے اور دوسرے حضرت علی ؓ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کے دسویں اَوتار ہیں۔ ہندوستان میں نو اَوتار پہلے سے پوجے جارہے تھے‘ پھر دسواں اَوتار حضرت علی ؓ کو منوا کر اس کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔

شرک فی الصفات

الحمدللہ ہم نے اقسامِ شرک کے حوالے سے شرک کی پہلی قسم ''شرک فی الذات'' کی کسی حد تک تفہیم حاصل کر لی ہے۔ اب ہم اللہ کی توفیق سے شرک کی دوسری قسم ''شرک فی الصفات'' کی بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ شرک فی الصفات کے بارے میں ابتدائی طور پر یہ جان لیجیے کہ یہ مسئلہ ذرا باریک اور علمی نوعیت کا ہے اور اس میں پاؤں کے پھسل جانے کا بڑی آسانی سے احتمال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زبان کی تنگ دامانی کے باعث صفات (Adjectives and attributes) کے طور پر جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں وہ خالق اور مخلوق کے مابین مشترک ہیں۔ یعنی وہی الفاظ ہم اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کرتے ہیں اور وہی مخلوق کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں کائنات بھی موجود' خدا بھی موجود' میں بھی موجود' آپ بھی موجود۔ اس طرح ایک وصف ''وجود'' مشترک ہو گیا اللہ تعالیٰ میں' اس کائنات میں' مجھ میں اور آپ میں۔ اسی طرح صفت ''حیات'' مشترک ہے اللہ اور مخلوق کے مابین۔ اللہ تعالیٰ بھی زندہ' ہم بھی زندہ' یہ چوپائے وغیرہ بھی زندہ۔ لفظ ''علم'' کا استعمال اللہ کے لیے بھی ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ اور بندوں کے لیے بھی' بلکہ انسانوں میں ''علّامة'' بھی ہوتے ہیں جو صفتِ علم کا مبالغے کا صیغہ ہے۔ لفظ ''ارادہ'' بندوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے کہ ''میرا یہ ارادہ ہے'' اور اللہ کے لیے بھی کہ ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾﴾ (یٰسٓ)۔ اسی طرح لفظ ''مشیت'' مشترک ہے اللہ اور مخلوق کے مابین۔ جیسے کسی صحابیٔ رسولؐ کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے: ''مَاشَاءَ اللّٰهُ وَمَا شِئْتَ'' (جو اللہ کی مشیت اور جو آپؐ کی مشیت) تو نبی اکرم ﷺ نے اُن کو سختی سے ٹوک دیا' اس لیے کہ اس سے شرک کا شائبہ جنم لے سکتا تھا' حالانکہ ان صحابیٔ رسولؐ کی نیت میں' معاذ اللہ' کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ تو صفات کے لیے جتنے الفاظ مستعمل ہیں وہ سب مشترک ہیں خالق اور مخلوق کے مابین۔ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی مستعمل ہیں اور مخلوقات کے لیے بھی' اور اسی سے فساد اور غلطی کا سارا احتمال پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ جب اِن الفاظ کا استعمال اللہ کے لیے ہوتا ہے تو ان کا مفہوم بالکل مختلف ہے اُس مفہوم سے کہ جس مفہوم میں ان الفاظ کا استعمال مخلوقات کے لیے ہوتا ہے۔ لفظ مشترک ہے جبکہ مفہوم جدا ہے۔

شرک فی الصفات سے بچاؤ کا فارمولا

اب یہ سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ اور انسانوں کی صفات الفاظ مشترک ہونے کے باوجود مفہوم و معنی میں کس طرح جدا ہیں۔ تین چیزیں اگر مدّنظر نہ رہیں اور ذہن میں مستحضر نہ رہیں تو شرک کا بلا ارادہ اور بلاشعور احتمال پیدا ہو جائے گا۔ پہلی چیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کا وجود بھی قدیم ہے اور اس کی صفات بھی قدیم ہیں' جبکہ ماسوی اللہ (جملہ مخلوقات) کا وجود بھی حادث ہے اور صفات بھی حادث ہیں۔ جو بڑے سے بڑے مشرک گزرے ہیں خدا کو تو انہوں نے بھی قدیم مانا ہے۔ ''تعدّدِ قدماء'' کا نظریہ رکھنے والوں کا عقیدہ تھا کہ اللہ بھی قدیم' روح بھی قدیم اور مادہ بھی قدیم۔ کچھ لوگوں نے ذرا رعایت کرتے ہوئے دو ہستیوں کو قدیم مانا ہے کہ خدا بھی قدیم اور مادہ بھی قدیم' جبکہ توحید یہ ہے کہ قدیم ہستی صرف اللہ کی ہے' باقی سب کو حدوث لاحق ہے کہ پہلے نہیں تھے' پھر ہو گئے۔

دوسری چیز یہ کہ اللہ کا وجود بھی ذاتی ہے اور صفات بھی ذاتی ہیں' جبکہ ماسوی اللہ کا وجود بھی عطائی ہے اور صفات بھی عطائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو از خود ہے' خود بخود ہے۔ کوئی اور تو اسے وجود دینے والا نہیں' معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ۔ اسی طرح اس کی صفات بھی ذاتی ہیں' کسی اور کی عطا کردہ نہیں' اس کو علم کسی اور نے نہیں دیا' معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ۔ جبکہ جملہ مخلوقات کا وجود بھی عطائی ہے' اللہ نے ہی سب کو وجود عطا کیا ہے۔ بقول شاعر:

لائی حیات آئے ' قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے ' نہ اپنی خوشی چلے

تو یہ قضا اور حیات تو بس ارادۂ خداوندی ہے' فیصلۂ خداوندی ہے' امرِ خداوندی ہے۔ اُس نے چاہا تو ہم ہو گئے۔ اسی طرح جملہ مخلوقات کی صفات بھی عطائی ہیں' ذاتی نہیں ہیں' اللہ نے عطا کی ہیں۔

تیسری چیز یہ کہ اللہ کی ذات بھی مطلق ہے اور صفات بھی مطلق ہیں' جبکہ ماسوی اللہ (جملہ مخلوقات) کا وجود بھی محدود ہے اور صفات بھی محدود ہیں۔ مطلق عربی زبان میں ''ط'ل'ق'' مادے سے ہے جس کا مطلب ہے آزادی' بے قید ہونا' لامتناہی ہونا' حدود اور نہایت سے مبرّا ہونا۔ ''طلاق'' کا مطلب یہی ہے کہ عورت کو نکاح کے بندھن سے آزاد کر دیا جائے۔ تو اللہ تعالیٰ کا وجود اور صفات مطلق' لامتناہی' حدود و قیود اور انتہا سے مبرّا ہیں۔ انگریزی میں اللہ تعالیٰ کو کہا جاتا ہے: ''The Absolute Being''۔ ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کے بیان کے لیے ایک ہی لفظ ''کُل'' کے دامن میں پناہ لیتے ہیں کہ: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ ''وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔'' اور: ﴿وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ ''وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

اس حوالے سے جان لیجیے کہ جب بھی کوئی لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بطور وصف یا صفت بولا جائے تو مذکورہ بالا تین تصورات ذہن میں مستحضر رہیں کہ (۱) اللہ تعالیٰ کی وہ صفت یا وصف قدیم ہے' اس میں حدوث کا کوئی شائبہ نہیں۔ (۲) وہ ذاتی ہے' کسی کا عطا کردہ نہیں۔ اور (۳) وہ مطلق اور لامتناہی ہے' اس میں کہیں کوئی حدّ و نہایت نہیں۔ اس کے بالکل برعکس جب وہی لفظ ہم مخلوقات میں سے کسی کے لیے بطور صفت یا وصف بولیں گے تو وہاں یہ تین تصورات ملحوظ رہیں گے کہ جیسے وہ چیز خود حادث ہے ویسے ہی اس کی وہ صفت بھی حادث ہے' جیسے اس کا وجود عطائی ویسے ہی اس کی صفت بھی عطائی ہے اور جیسے اس کا وجود محدود ہے ویسے ہی اس کی صفت بھی محدود ہے۔ تو یہ تینوں تصورات اگر ہر وقت مدّنظر رہیں تو صفات کے معاملے میں آدمی شرک میں ملوث نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ان میں سے کسی میں بھی ٹھوکر کھا گئے تو ''شرک فی الصفات'' کا راستہ کھل جائے گا۔ یہ الجبرے کے فارمولے کی طرح بالکل واضح بات ہے۔ اس کو سمجھ لیا جائے تو بڑے بڑے مسائل اور عقدے حل ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ گویا وہ کلید ہے کہ جس سے ہمارے ہاں عقائد کی بحثوں کے جو بڑے بڑے تالے پڑے ہوئے ہیں وہ کھلتے چلے جائیں گے۔

دورِ جدید کا سب سے بڑا شرک

اب جو اِس دَور کا سب سے بڑا شرک ہے پہلے اسے سمجھ لیا جائے' جس کے بارے میں مَیں اپنے بارے میں بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں اس سے بالکل بری ہوں۔ اللہ ہی جس کو بچا لے وہ بچ جائے گا' ورنہ اللہ کی توفیق کے بغیر اس سے بچنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ شرک کیا ہے؟ وہ ''مادّہ پرستی کا شرک'' ہے۔ اصل میں ایک نظریہ' ایک خیال اور ایک مغالطہ دنیا میں رہا تو ہمیشہ سے ہے' لیکن اِس دَور میں آ کر اس نے ایک فلسفہ' فکرِ انسانی کے لیے ایک بہت بڑے محور اور مرکز کی حیثیت اختیار کر لی ہے' اور وہ یہ ہے کہ مادہ کی صفات (Properties of the matter) مستقل ہیں' دائم ہیں' غیر متبدل (immutable) ہیں' ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی' یہ صفات مادے سے منفک نہیں ہو سکتیں اور قوانین طبیعی (Laws of the

(Nature کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔ جب سے سائنس کا دَور دورہ شُہرہ اور غلغلہ ہوا ہے اور جب سے ذہنوں پر اس کی چھاپ بہت گہری ہوگئی ہے اور سائنسی اکتشافات نے انسان کو مبہوت اور مرعوب کر دیا ہے تب سے یہ فکر ہمارے ذہنوں میں پیوست ہو گیا ہے کہ مادے کی صفات مستقل ہیں' دائم ہیں' ہمیشہ بروئے کار آتی ہیں' کوئی صورت نہیں ہے کہ مادے سے اس کی صفت منفک ہو جائے' بلکہ وہ اپنی جگہ مستقل بالذات ہے۔ گویا کہ ہم نے آج مادے کو اُس مقام پر بٹھا دیا ہے جہاں اصلاً اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ صفات تو اللہ تعالیٰ کی مستقل اور دائم ہیں' قانون تو اس کا ہے جو کبھی نہیں بدلتا۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے بچے کو وصیت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ: **لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِیْقَةِ وَلَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰہُ** ''فاعلِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی اللہ کے سوا کوئی نہیں''۔ جیسے حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے: ﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾﴾ ''اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کیجیو! یقیناً شرک بہت بڑا ظلم (اور بہت بڑی ناانصافی) ہے۔''

اصل حقیقت یہ ہے کہ آگ میں جلانے کی تأثیر ہے' لیکن یہ اس کی ذاتی نہیں ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ ہے اور اُسی وقت بروئے کار آئے گی جب اللہ چاہے گا۔ آگ کو جلانے کی صفت ودیعت کرنے کے بعد' معاذ اللہ' اللہ کے ہاتھ بندھ نہیں گئے کہ مَیں تو آگ میں جلانے کی صفت پیدا کر چکا' بدبختوں نے ابراہیم علیہ السلام کو اٹھا کر آگ میں پھینک دیا ہے تو اب میں کیا کروں! معاذ اللہ۔ آگ کا وصف ذاتی اور مستقل نہیں' بلکہ اللہ کے اِذن کے تابع ہے۔ آگ اُسی وقت جلائے گی جب اللہ کا اِذن ہوگا' اگر نہیں ہوگا تو نہیں جلائے گی۔ لہٰذا تمام صفاتِ مادہ تابع ہیں مشیتِ خداوندی کے' یہ مستقل بالذات نہیں ہیں۔ نیوٹونین فزکس یعنی جو فزکس کا ابتدائی دَور تھا' اس میں بڑا اِذعان اور بڑا یقین تھا کہ جو قوانین ہم نے دریافت کر لیے ہیں یہ حتمی ہیں' ان میں کسی تبدیلی کا امکان ہی نہیں ہے۔

"We have discovered the final truth."

اور ''قانون بقائے مادہ'' کی رو سے مادہ لازوال اور غیر فانی ہے:

(Matter is indestructible.)

اور matter اور energy دو جدا کیٹیگریز ہیں۔ یہ نیوٹن کی فزکس کے مبادیات تھے۔ ان کا جب ہمارے عقائد' مذہبی فکر اور ایمانی نظریات کے ساتھ تصادم ہوا تو اس کا پہلا مظہر یہ سامنے آیا کہ اب معجزات کی کیا تعبیر و تأویل کی جائے! مغربی فکر اور استعمار کا یہ ریلا اتنا شدید تھا کہ بیچارے سرسید احمد خان جیسا مخلص مسلمان بھی ثابت قدم نہ رہ سکا اور اس سیلاب کی رو میں بہہ گیا۔

اُس وقت ایک طرف مغربی تہذیب' مغربی استعمار اور مغربی قوت تھی' ان کی فوجیں آ رہی تھیں۔ اور دوسری طرف اُن کا فکر آ رہا تھا' سائنس بڑے زور و شور کے ساتھ آ رہی تھی تو اس سیلاب کے آگے کھڑے رہنا آسان نہیں تھا' لہٰذا بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے اور انہوں نے قرآنی تعلیمات کو مغربی فکر کے سانچے میں ڈھالنے اور اس کے موافق بنانے کی کوشش کی۔ اُن کے لیے یہ مشکل پیدا ہوئی کہ پانی تو اپنی سطح برقرار رکھتا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ عصاءِ موسیٰ کی ضرب سے سمندر کا پانی پھٹ گیا؟ سرسید کے فکر کی ترجمانی کی جائے تو وہ یہ ہوگی کہ یہ تو بڑی مصیبت ہے کہ قرآن میں ایسی ہلکی بات آ گئی' اب ہم دنیا کو کیا مُنہ دکھائیں؟ ہمارے لیے تو اِس سائنسی دَور میں لوگوں سے آنکھیں چار کرنا ممکن نہیں رہا۔ لہٰذا اس کی کوئی ایسی تأویل اور تعبیر کرو کہ مذہب اپنی جگہ قائم رہ جائے اور سائنس اپنی جگہ قائم رہ جائے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ اصل میں یہ تو مدّ و جزر کی بات تھی جسے مولویوں نے سمجھا نہیں اور اسے خواہ مخواہ ایک عجوبہ اور معجزہ قرار دے دیا اور ایک افسانہ بنا لیا۔ جوار بھاٹا سمندر میں آتا ہی رہتا ہے۔ کبھی سمندر recede کر جاتا ہے' پیچھے کو ہٹ جاتا ہے اور خشکی نکل آتی ہے' کبھی سمندر چڑھاؤ پر آتا ہے تو پانی ہی پانی ہو جاتا ہے۔ اصل میں سمندر اُس

وقت جزر پر تھا جبکہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر نکل گئے' اور جب فرعون اپنے لشکر سمیت گزرنے لگا تو اُس وقت سمندر مدّ پر آ گیا' لہٰذا فرعون لشکر سمیت ڈوب گیا۔ یہ تأویل درحقیقت سرسید کی اس سوچ کی عکاسی کرتی ہے کہ وہ سائنسی فکر' اس کے رعب و دبدبے اور جاہ و جلال کے مقابلے میں اپنے تئیں اسلام کا دفاع کر رہے تھے۔ اس حوالے سے سرسید ہمدردی کے مستحق ہیں۔ یہ درحقیقت اس مغربی فکر کا پہلا حملہ تھا جو ہم پر ہوا' جس کے نتیجے میں معجزات کا انکار ہوا اور ہر چیز کی تأویل کرنے کی کوشش کی گئی۔ انسان کے ذہن میں جب کوئی فکر راسخ ہو جاتا ہے تو بڑی بڑی حقیقتیں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں' وہ گویا اندھا ہو جاتا ہے اور راستے کے بڑے بڑے پتھر اسے نظر نہیں آتے۔ اور ایسا بڑے بڑوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ سرسید احمد خان پر جب یہ فکر مسلط ہو گیا تو انہیں قرآن میں یہ الفاظ نظر نہیں آئے: ﴿فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿٦٣﴾﴾ (الشُّعراء) ''پس سمندر پھٹ گیا تو اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا''۔ اِنْفَلَقَ یَنْفَلِقُ کا مطلب ہے پھٹ جانا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے قرآن مجید میں ''فَالِقُ الْاِصْبَاحِ'' (رات کی تاریکی کا پردہ پھاڑنے والا) اور ''فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی'' (دانے اور گٹھلی کا پھاڑنے والا) کے الفاظ آئے ہیں۔ تو یہاں فَانْفَلَقَ کا ترجمہ مدّ و جزر کسی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح مذکورہ بالا آیت کے اگلے الفاظ ہیں: ﴿فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿٦٣﴾﴾ ''تو (سمندر کا) ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا۔'' اب ان الفاظ سے مدّ و جزر مراد ہونے کا تو کوئی امکان ہی نہیں' اس کی اس فطری مظہر (مدّ و جزر) کے ساتھ سرے سے کوئی مناسبت نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ جب کوئی فکر کسی سبب سے انسان کے ذہن کے اوپر اس طرح مستولی ہو جاتا ہے تو بڑی بڑی حقیقتیں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور بعینہٖ یہی معاملہ سرسید احمد کے ساتھ پیش آیا۔ اور صرف انہی کے ساتھ نہیں' اور بھی کئی بڑے بڑوں کے ساتھ یہی معاملہ ہوا ہے۔

میں یہاں ایک مثال مولانا ثناء اللہ امرتسری کی دیتا ہوں۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے' پکے اہلحدیث تھے' اسلامی روایات' قرآن مجید اور حدیث کو تھامنے والے تھے۔ لیکن وہ دَور ہی ایسا تھا کہ ایک جگہ اُن کے قدم بھی پھسل گئے۔ سورۃ البقرۃ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مکالمہ نقل ہوا ہے کہ ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی: ﴿رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ﴾ ''اے میرے پروردگار! مجھے دکھا دے تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے!'' اللہ تعالیٰ نے فوراً سوال کیا: ﴿اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ﴾ ''کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟'' اس پر ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: ﴿بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ﴾ ''کیوں نہیں (میں یقیناً ایمان رکھتا ہوں) لیکن ذرا مزید اطمینانِ قلبی درکار ہے۔'' اس کے بعد حکم دیا گیا: ﴿فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ﴾ ''تو چار پرندے لے لو اور انہیں اپنے سے ہلا لو (مانوس کر لو)۔'' ﴿ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ﴾ (آیت ۲۶۰) ''پھر (انہیں ذبح کر کے) اُن کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو' پھر اُن کو پکارو' وہ تمہارے پاس دوڑتے چلے آئیں گے۔'' یہاں ﴿فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ﴾ ''تو انہیں اپنے ساتھ مانوس کر لو'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ پرندے آپ کو پہچان لیں جن کو آپ نے ٹکڑوں میں بانٹا ہے اور آپ اُن کو پہچان لیں کہ یہ وہی پرندے' کبوتر یا تیتر وغیرہ ہیں جن کے آپ نے ٹکڑے کیے ہیں' کوئی اور نہیں ہیں جو بلانے پر آ گئے ہوں۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا ثناء اللہ امرتسری کے لیے مسئلہ پیدا ہوا کہ اس سائنسی سوچ کے دَور میں یہ بات کیسے کہیں۔ لہٰذا انہوں نے تأویل کی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ چار پورے پورے پرندے مختلف پہاڑوں پر رکھو اور انہیں پکارو تو وہ آ جائیں گے۔ اب یہ مشاہدہ تو ہر تیتر باز اور بٹیر باز کو ہوتا ہے کہ وہ خود سے مانوس تیتر یا بٹیر کو اپنے پاس بلاتا ہے' سیٹی بجاتا ہے تو وہ آ جاتا ہے۔ اگر اس سے یہی مراد ہے تو اِس قدر اہتمام کے ساتھ اور احیاءِ موتی پر اطمینانِ قلب حاصل کرنے کی دعا کے جواب میں یہ بات کیوں کہی گئی؟ جس میں ابتداءً ذرا ڈانٹ کا انداز بھی آ گیا کہ کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا کہ پروردگار! میں مانتا تو ہوں لیکن ذرا اطمینانِ قلبی درکار ہے۔ جب مولانا ثناء اللہ امرتسری سے کہا

گیا کہ آپ نے اس آیت کی یہ تاویل کیوں کر دی' تو انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ میں کیا کروں' مجھے دوسروں کے سامنے بات پیش کرنی ہے۔ تو یہ ہے اصل بات کہ جس دَور کے لوگوں سے خطاب کرنا ہو اُن کے مسلّمات کا کچھ تو لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔

تو پہلی بات یہ جان لیجیے کہ اگر آپ نے کسی کے کسی وصف کو دائم اور مستقل بالذات مان لیا تو آپ شرک فی الصفات کے مرتکب ہو گئے۔ اس لیے کہ قائم ودائم' مستقل بالذات اور مطلق اوصاف تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہیں' کسی اور کے اندر کوئی صفت' تاثیر یا وصف مستقل نہیں' مطلق نہیں' ہمیشہ سے نہیں اور ہمیشہ رہنے والا نہیں۔ ہر شے اور ہر ہستی کے اوصاف تابع ہیں اذنِ خداوندی کے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اُن کا ظہور ہو گا ورنہ کسی صفت کی کوئی تاثیر ظاہر نہیں ہو سکتی۔

مذکورہ بالا سائنسی طرزِ فکر کی وجہ سے ذہنوں میں جو سوچ پختہ اور راسخ ہوئی ہے اسے ''مادہ پرستی کا شرک'' کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ہمارا سارا توکل اور انحصار مادی اسباب و وسائل پر ہے' اگر یہ حاصل ہیں تو دلجمعی بھی حاصل ہے' یہ نہیں ہیں تو دل اُڑا ہوا ہے۔ اللہ کی قدرت پر اتنا یقین نہیں ہے جتنا کہ مادی وسائل کے نتائج پر یقین ہے۔ نتیجتاً سارا بھروسہ اور توکل ذاتِ خداوندی سے ہٹ کر مادی اسباب و وسائل کے ساتھ منسلک ہو گیا ہے۔ حکمتِ قرآنی کی جڑ توحید ہے اور ''تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا'' کے مصداق توحید کو سمجھنے کے لیے شرک کو سمجھنا پڑے گا۔ رات کو دن کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے اور دن کی حقیقت رات کے حوالے سے روشن ہوتی ہے۔ چنانچہ توحید کو سمجھنے کے لیے شرک کو سمجھنا ضروری ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں توحید کو مثبت انداز میں اور شرک کو منفی انداز میں خوب عیاں کیا گیا ہے۔ ان دونوں سورتوں کو میں ''حکمتِ قرآنی کے عظیم ترین خزانے'' قرار دیتا ہوں۔ سورۂ بنی اسرائیل کے بالکل آغاز میں فرمایا گیا:

﴿وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰہُ ھُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا ﴿۲﴾﴾

''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) عطا فرمائی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت نامہ بنایا (رہنمائی قرار دیا) کہ میرے سوا کسی اور کو اپنا وکیل (کارساز) نہ بنا لینا۔''

''وَکِیْلٌ'' کا مادہ 'و ' ک ' ل'' ہے اور مطلب ہے جس پر توکل اور بھروسہ ہو' جس سے اُمیدیں وابستہ ہوں' جس کو کارساز سمجھا گیا ہو' جس کو کسی بھی مسئلے میں اپنی مشکل کا حل سمجھا جا رہا ہو۔ سورۃ المؤمن میں مؤمنِ آلِ فرعون کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ط اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾﴾ ''اور میں اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں' یقیناً اللہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے''۔ ''توحید فی التوکل'' یہی تو ہے کہ سارا بھروسہ' دارومدار اور انحصار اسباب و وسائل کے بجائے اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو۔ اسباب و وسائل کی نفی قطعاً نہیں ہے' لیکن یہ کہ کوئی بھروسہ اُن پر قطعاً نہ ہو۔ سورۃ الانفال میں فرمایا گیا: ﴿وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ......﴾ (آیت ۶۰) ''اور اپنی امکانی حد تک ان (کفار) کے مقابلے کے لیے طاقت تیار رکھو''' یعنی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنے کے بجائے جتنے بھی اسباب و وسائل فراہم کر سکتے ہو کرو' لیکن تمہارا توکل ان اسباب و وسائل پر نہ ہو۔ یہ حقیقت ذہن نشین رہے کہ اسباب سے کچھ نہیں ہو گا' بلکہ ہو گا وہی جو اللہ چاہے گا۔ اور اللہ بغیر اسباب کے بھی نتیجہ پیدا کر سکتا ہے' وہ اسباب کا محتاج قطعاً نہیں' اور اللہ تعالیٰ اسباب کے ہوتے ہوئے الٹا نتیجہ بھی برآمد کر سکتا ہے' وہ اسباب کا پابند نہیں۔

ان دونوں میں سے کوئی پہلو بھی اگر آپ کے ذہن میں ہے تو آپ ''شرک فی التوکل'' کے اندر ملوث ہو گئے۔ میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ نے کہیں جانا ہے اور آپ کے پاس کار یا کوئی اور سواری درست حالت میں موجود ہے' آپ نے اس کے لیے پٹرول کا انتظام بھی کر لیا ہے اور آپ نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ آپ صبح اُٹھ کر لازماً اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ اگر آپ کو یقین ہو گیا ہے کہ اب آپ کے روانہ ہونے

میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور آپ یہ بھول گئے ہیں کہ ان اسباب کے اوپر ایک مُسبّب الاسباب ہستی بھی ہے اور سارے وسائل کے جمع ہونے کے باوجود بھی آپ اُس کے اِذن کے بغیر ہل نہیں سکتے تو آپ گویا مادہ پرستی کے شرک میں مبتلا ہو گئے' شرک فی التوکل میں ملوث ہو گئے۔ یہ اصل میں مجوبیت ہے کہ آپ اسباب کے پردے میں مجوب ہو گئے' اسباب کا یقین آپ کے دلوں میں پیدا ہو گیا۔ آپ کے ذہن میں اسباب پر توکل پیدا ہو گیا' آپ نے اپنے دل کے سنگھاسن پر مادی اسباب و وسائل کو بٹھا دیا' اللہ سے نگاہیں مجوب رہ گئیں۔ جیسے اقبال نے کہا:

بُتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

ہمارا طرزِ عمل ہمیشہ یہی ہونا چاہیے کہ جب بھی کسی کام کا ارادہ کریں تو مقدور بھر اسباب و وسائل بروئے کار لانے کے بعد زبان پر الفاظ ہوں ''اِن شاء اللہ'' اور دل میں یہ پختہ یقین ہو کہ تمام اسباب و وسائل اذنِ خداوندی کے محتاج ہیں اور نتیجہ وہی نکلے گا جو اللہ چاہے گا۔ اسباب و وسائل پر یقین کرتے ہوئے کبھی یہ نہیں کہنا چاہیے کہ ''میں کل یہ کام ضرور کروں گا''۔ اگر کوئی عامی انسان یہ کہہ رہا ہو تو اس کی فوری پکڑ نہیں ہو گی' اس لیے کہ اس کی اپنی ذہنی سطح ہے' اسے ابھی وہ قلبی ترفّع حاصل نہیں ہوا' وہ تو اسباب و وسائل ہی کے چکر میں ہے' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر نبی کریم ﷺ کی گرفت فرمائی۔ مشرکین مکہ نے آپ ﷺ سے کچھ سوالات کیے کہ ذرا بتائیے اصحابِ کہف کون تھے' روح کی حقیقت کیا ہے' ذوالقرنین کون تھا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے یہ سوچ کر کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آتے ہی رہتے ہیں' ان سے پوچھ لوں گا' کہہ دیا: ''میں کل جواب دے دوں گا'' اور ''اِن شاء اللہ'' نہ کہا' تو آپ ؐ کی گرفت ہو گئی۔ اس لیے کہ ''حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ'' کہ بہت سی چیزیں جو اَبرار کے لیے نیکیاں ہو سکتی ہیں وہی مقربین کے لیے قابل گرفت ہو سکتی ہیں' ان کے مرتبے سے فرو ہو سکتی ہیں۔ اب حضرت جبرائیلؑ نہیں آ رہے اور لوگ تالیاں پیٹ رہے ہیں کہ محمدؐ! کیا جوابات ہیں اِن سوالوں کے؟ نبی اکرم ﷺ خاموش ہیں۔ آپ ذرا سوچیے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کے لیے کس قدر تشویش ناک اور نازک صورت حال ہو گی۔ لیکن یہ کہ حکمتِ خداوندی یہی تھی کہ آپ ؐ کی گرفت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ﴾

(الکھف:۲۳'۲٤)

''اور (اے نبیؐ!) کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کام کروں گا' مگر (اس استثناء کے ساتھ کہ) اگر اللہ نے چاہا۔''

اس کے بعد سورۃ الکہف میں اُن سوالات کے جوابات نازل فرمائے گئے۔

تو یہ ہے اصل میں ''توحید فی التوکل'' کہ کسی شے سے کچھ نہیں ہو سکتا' جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔ اس پر بحث اِن شاء اللہ جاری رہے گی۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلماتoo